مولانا حالی کی ادبی خدمات

خواجہ محمد زکریا

ABSTRACT:

Hali has contributed a lot to enrich Urdu Literature. He never walked in the beaten tracks. He was the forerunner of the modern Urdu poetry and has greatly influenced the succeeding generations of poets. In prose he remains till today the best biographer and his 'prolegomenon' is still being acknowledged as the best book on theoretical criticism in Urdu.

The Writer of this article has taken pains in elaborating Hali's overall contribution to Urdu Literature and has thrown fresh light on some of the aspects of his prose and poetry.

الطاف حسین حالی نے ترجمۂ حالی کے نام سے مختصر آپ بیتی لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنا سالِ ولادت 'تقریباً ۱۲۵۳ھ' مطابق ۱۸۳۷ء قرار دیا ہے۔(۱) 'تقریباً' کا لفظ ہمیں انتباہ کرتا ہے کہ اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ان کا سالِ وفات اکثر جگہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء تحریر کیا گیا ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> ۱۳ر صفر ۱۳۳۳ ہجری مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ عیسوی کو جمعرات کے دن، رات کے دو بجے حضرت شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی کا پانی پت میں انتقال ہوا اور دوسرے دن یکم جنوری ۱۹۱۵ عیسوی کو وہ حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے بیرونی احاطے میں حوض کے کنارے دفن کیے گئے۔(۲)

شیخ صاحب حالی کی وفات کے وقت پانی پت میں تھے اور حالی سے روابط رکھتے تھے اس لیے وقت کی یہ تخصیص شبہے سے بالاتر ہے۔ بارہ بجے شب کے بعد اگلی تاریخ شروع ہو جاتی ہے اس لیے دو بجے رات کو انتقال کا مطلب ہے کہ درست تاریخ وفات یکم جنوری ۱۹۱۵ء بروز جمعہ ہے نہ کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء بروز جمعرات۔

حالی اردو ادب کی تاریخ میں واحد شخص ہیں جو شاعری اور نثر میں یکساں مقام کے حامل ہیں۔ اعلیٰ درجے

کی غزل گوئی، مسدس مد و جزر اسلام جیسی موثر طویل نظم، نیچرل شاعری کی نظمیں، شخصی مرثیے، مختلف ہیئتوں میں قومی، اخلاقی اور سماجی نظمیں وغیرہ انھیں صفِ اوّل کے شاعروں میں جگہ دلاتی ہیں جب کہ حیات سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، مقدمہ شعر وشاعری اور متنوع موضوعات پر لکھے ہوئے نثری مضامین کی وجہ سے انھیں چند اہم نثر نگاروں میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ اردو ادب کی پوری تاریخ میں حالی کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں جو شاعری اور نثر میں یکساں اہمیت کا حامل ہو اور جس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو کہ وہ بڑا شاعر ہے یا نثر نگار۔ تاہم اردو ادب کی تاریخ میں اتنی اہمیت اختیار کرنے والے شخص کی تعلیم بالکل بے قاعدہ ہوئی۔

پانی پت میں حفظِ قرآن اور ابتدائی روایتی تعلیم کے بعد ۱۸۵۴ء میں سترہ سال کی عمر میں وہ افرادِ کنبہ کو اطلاع دیے بغیر دہلی چلے گئے جہاں انھوں نے مختلف مساجد اور مدارس کے علماء سے عربی، فارسی، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ دِلّی کے ڈیڑھ سالہ قیام میں اس سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان کی غالب سے بھی چند ملاقاتیں ہوئیں۔ انھوں نے غالب سے ان کے دقیق اردو اشعار سمجھے اور چند فارسی قصائد بھی پڑھے۔[۳] یہی زمانہ ہے جب حالی نے شعر گوئی شروع کی اور غالب کو ایک آدھ غزل سنائی جس پر غالب نے کہا ''اگر چہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔''[۴]

۱۸۵۵ء میں عزیزوں نے دلی میں انھیں ڈھونڈ نکالا اور پانی پت واپسی پر مجبور کر دیا۔ پھر ۱۸۵۶ء میں حصار میں ایک معمولی ملازمت مل گئی (غالبًا نائب قاصد) اور جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہوئے تو وہ پا پیادہ گرتے پڑتے فاقے کرتے پانی پت پہنچے جس نے ان کی صحت مستقل طور پر خراب کر دی۔ چار سال پانی پت میں بیکاری کی حالت میں بسر کیے مگر عربی، فارسی اور اردو کتب کا مطالعہ دقتِ نظر سے جاری رکھا۔ بیکاری سے تنگ آ کر ۱۸۶۲ء میں پھر دِلّی گئے۔ انھی دنوں غالب کے توسط سے شیفتہ سے ملاقات ہوئی جو اپنے بیٹے کے لیے کسی اتالیق کی تلاش میں تھے۔ حالی کو انھوں نے اس کام کے لیے بہت موزوں سمجھا چنانچہ وہ انھیں اپنی جاگیر پر جہانگیر آباد ضلع بلند شہر لے گئے۔ حالی سات آٹھ برس وہاں رہے۔ اس دوران دِلّی بھی آتے جاتے رہے۔ شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ جہانگیر آباد کے قیام کے زمانے میں شیفتہ کے ہاں رقص، موسیقی وغیرہ کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، حالی بھی ان سے متاثر ہوئے۔ ان کے کلام میں موسیقی کی اصطلاحیں موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ کلاسیکی موسیقی سے آگاہی رکھتے تھے۔ شیفتہ خود بھی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ جہانگیر آباد کے قیام سے حالی کے روزگار کا مسئلہ حل ہوا اور اتنی فراغت نصیب ہوئی کہ شاعری کی طرف باقاعدہ متوجہ ہوئے۔ دہلی میں بھی غالب کے علاوہ دیگر مشہور شعراء سے ملاقاتیں ہوئیں اور مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ دیوانِ حالی میں شامل بیشتر قدیم غزلیں اسی زمانے میں یعنی ۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۹ء کہی گئی ہیں۔ ۲۹؍ستمبر ۱۸۶۹ء کو شیفتہ کا انتقال ہو گیا۔ قبل ازیں اسی سال ۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا اس نے بطورِ شاعر ان کی اہمیت تسلیم کرائی۔ کچھ اور متفرق کلام بھی لکھا۔ اسی شعری سرمائے کو لے کر وہ ۱۸۷۰ء میں لاہور پہنچے جہاں وہ محکمہ تعلیم کے ایک ذیلی محکمے گورنمنٹ بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر مقرر ہوئے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جانے والی

کتابوں کی عبارت کی تصحیح ان کے فرائض میں شامل تھی۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ غالبًا یہ کتابیں انگریزی نثر کی تھیں اور غالبًا ادبیات سے زیادہ علوم وفنون سے تعلق رکھتی تھیں۔ چار سال ان ترجموں کے مطالعہ و تصحیح سے مغربی ادب اور علوم وفنون سے انھیں آ گاہی ہوتی رہی اور نامعلوم طور پر عام فارسی (اور اردو) لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہوگئی۔

حالی لاہور کے قیام میں تنہائی اور خرابیِ صحت کے ہاتھوں بہت پریشان رہے لیکن ان کی علم و ادب سے سچی لگن کا ثبوت یہ ہے کہ فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک ناول **مجالس النساء** لکھا۔ طبقات الارض پر ایک فرنچ کتاب **مبادیِ علم جیالوجی** کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور ۱۸۷۴ء میں منعقد ہونے والے نو نظمیہ مشاعروں میں سے چار میں شرکت کی اور برکھا رت، نشاطِ امید، حبِ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف کے عنوانات پر نظمیں پڑھیں۔ یہ کسی قدر طویل نظمیں ہیں۔ کوئی نظم سو اشعار سے کم نہیں اور چاروں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ چونکہ مشاعروں کے لیے عنوانات منتخب کر کے شاعروں کو دیے جاتے تھے اور عنوانات بھی ایسے جن پر اچھی نظمیں لکھنا اور وہ بھی وقت مقررہ کے اندر مشکل کام تھا اور ان میں شعریت پیدا کرنا دقت طلب تھا اس لیے حالی کی ان چار نظموں میں **برکھارت** ہی کو اچھی نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۸۷۴ء کے آخر یا ۱۸۷۵ء کے شروع میں حالی اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس مقرر ہو گئے جہاں وہ تقریباً چودہ سال مقیم رہے۔ ۱۸۷۵ء تا ۱۸۸۸ء حالی کی بہترین شعری تخلیقات کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں سرسید تحریک سے ان کا تعلق مضبوط اور گہرا ہوا۔ علی گڑھ میں آمد و رفت شروع ہوئی۔ سرسید احمد خاں کے قریبی رفقاء میں شامل ہوئے اور علی گڑھ تحریک کی تعلیمی اور سماجی پیش رفت کے لیے مختلف شہروں کے دورے کیے۔

اس زمانے میں ان کی اہم ترین تخلیق **مسدس مد و جزرِ اسلام** ہے جو ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مسدس سے ایک سال پہلے ایک طویل انگریزی نظم 'زمزمۂ قیصری' کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ فارسی متن سے قریب رہ کر کیا جانے والا یہ ترجمہ بڑی جاں کاہی سے کیا گیا ہے۔ اس کے نثری حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی انگریزوں کے انتہائی عروج کے اس دور میں بھی ان کے خلاف لکھنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ مسدس کے بعد اگلے سال پچپن بند کی طویل نظم ترکیب بند بعنوان 'مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند' لکھی۔ پھر ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۸ء مناظرۂ تعصب و انصاف (۲۰۴ اشعار)، کلمۃ الحق، مناجاتِ بیوہ، بھائی سجاد حسین کا مرثیہ، مسدسِ تنگِ خدمت، قصیدہ ملکہ وکٹوریا، پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ، مثنوی حقوقِ اولاد، ترکیب بند بعنوان شکوۂ ہند، مشہور مناجات: 'اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے' جیسی تخلیقات ان کے قلم سے نکلیں۔ ۱۸۸۹ء میں حیدرآباد کے حوالے سے نظمیں، پھر حکیم محمود علی کا پُر تاثیر مرثیہ (۱۸۹۲ء) ملکہ وکٹوریا اور سرسید کی وفات پر فارسی اور اردو مرثیے، حیدرآباد کے سلسلے کی مزید نظمیں، نواب رامپور کے لیے توصیفی نظمیں، اور ۱۹۰۶ء میں 'چپ کی داد' جیسی منفرد نظم جو حقوقِ نسواں کے موضوع پر ہے اور اس طرح کی دیگر متفرق شاعری کا سلسلہ وفات تک جاری رکھا۔

ان تمام تخلیقات کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں اس لیے غزلیات، مسدس مد و جزرِ

اسلام اور چند اہم نظموں کے جائزے تک یہ مضمون محدود رہے گا۔

حالی نے دیوانِ حالی ۱۸۹۳ء میں مرتب کر کے شائع کیا جس کا پہلا حصہ دیوان کے مقدمے کی حیثیت سے شاملِ کیا گیا تھا لیکن اشاعت کے ساتھ ہی 'مقدمہ' اہم تر حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے خلاف اورحق میں بہت کچھ لکھا گیا اس لیے کئی سال بعد یہ دیوانِ حالی سے الگ کر دیا گیا اور **مقدمۂ شعر و شاعری** کے نام سے الگ کتاب کے طور پر چھپنے لگا۔ 'دیوانِ حالی' کے ساتھ ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا گیا جو نثری اسلوب کا عمدہ نمونہ ہے۔ 'دیوانِ حالی' میں غزلوں کی کل تعداد ایک سو سولہ ہے اور **جواہراتِ حالی** میں جو وفاتِ حالی کے بعد شائع ہوا صرف سات غزلیں ہیں، گویا اب تک حالی کی کل ۱۲۳ غزلیں مل سکی ہیں اور بظاہر ان میں اضافے کا امکان بہت کم ہے۔ اشعار کی تعداد بھی ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مختصر دیوانِ غزلیات ہے لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت کم دواوین اس کے ہم پلّہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے اردو غزل کا رخ بدل دیا ہے اور اس میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

کلاسیکی غزل کی روایت لکھنو میں ناسخ و آتش اور دِلّی میں غالب، مومن اور ذوق کے ساتھ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ پھر ان کے شاگردوں کے ہاں اساتذہ کے موضوعات و اسالیب کی تکرار ہوتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد چند ہی برسوں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ نئی تعلیم، نئی تہذیب، نیا عدالتی نظام، نئے تعزیراتی قوانین، نیا بلدیاتی نظام، نیا سول انتظامی ڈھانچا، نئے شہر، کھلی سڑکیں، پارک، عمارتیں، کلبیں وغیرہ وغیرہ ملک کو ظاہری طور پر ہی تبدیل نہیں کر رہی تھیں، اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اذہان بھی تبدیلیوں سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ داغ، امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی وغیرہ کے ہاں کلاسیکی غزل کا آخری دور ابھی زندہ تھا لیکن حالی، شبلی، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی وغیرہ کی نئے انداز کی نظمیں اور غزلیں لوگوں کو شاعری کے نئے ذائقے سے آشنا کر رہی تھیں اور رفتہ رفتہ نئے تعلیم یافتہ لوگ پرانی تعلیم والوں کی جگہ لے رہے تھے جنھیں کلاسیکی شعراء کے طرز کے مقابلے میں نیا طرز گوارا تر تھا چنانچہ حالی کی غزل رفتہ رفتہ جگہ بنا رہی تھی۔ اکبر اور ان کے بعد اقبال کے ہاں انھی موضوعات و اسالیب میں بہت وسعت پیدا کی گئی ہے اور حالی کی بنیاد پر شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

حالی نے اپنی غزل کو قدیم و جدید میں تقسیم کیا ہے جس سے بہت لوگ گمراہ ہوئے ہیں۔ ذیل میں رشید حسن خان کی رائے درج ہے جو اس قسم کی دیگر آرا کی نمائندگی کرتی ہے:

> رنگ جدید کی ترجمان جو غزلیں ہیں ان کی سطحیت اور بے رنگی اس پر دلالت کرتی ہے کہ غزلیہ شاعری کو جب سماجی افادیت اور قومی اصلاح کا ترجمان بنایا جائے گا تو یہ مقاصد خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، غزل اس لطافت اور نفاست سے محروم ہو جائے گی جو اس کی امتیازی صفت رہی ہے۔ اس میں نہ تہ داری ہوگی نہ تاثیر۔(۵)

محققوں اور نقادوں کا مسئلہ یہ ہے کہ بیک وقت مختلف النوع مصروفیات میں مبتلا رہتے ہیں اور بعض اوقات جب وہ اپنی ترجیحات سے ہٹتے ہیں تو ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ کسی مسئلے پر پوری طرح تحقیق کر کے کسی

نتیجے پر پہنچیں۔ حالی کی بہت سی قدیم غزلوں میں ان کی جدید غزلوں کے انداز میں اشعار مل جائیں گے اور جدید غزلوں میں متعدد ایسے شعر مل جائیں گے کہ اگر انھیں قدیم غزلوں میں کھپا دیا جائے تو محض ذوقِ شعر پر بھروسا کر کے ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ذیل کے اشعار ان کی جدید غزلیات سے لیے گئے ہیں لیکن ان کا اندازِ بیان اتنا شاعرانہ اور موثر ہے کہ قدیم انداز سے تجاوز نہیں کرتا:

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

....

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

....

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

....

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

....

رنجش و الطاف و ناز و نیاز ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں لائی ہے بوئے انس نسیم چمن کہاں!

....

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

....

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

یہ تمام اشعار موضوعات اور لفظوں کے چناؤ کے باعث کلاسیکی غزل سے انحراف نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ حالی کی جدید غزل کا دائرہ اس قسم کے اشعار سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ درحقیقت حالی کی جدید غزل کئی لحاظ سے قدیم غزل کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہے۔

حالی کی جدید غزل کو اردو غزل کے تاریخی پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ حالی سے ذرا پہلے کی لکھنوی غزل میں آتش و ناسخ کے مقلدین مثلاً وزیر لکھنوی، وزیر علی صبا، سید محمد رند، برق لکھنوی، مظفر علی اسیر، علی اوسط رشک، اسد علی قلق، بحر لکھنوی، امانت لکھنوی، نظام رامپوری، امیر اللہ تسلیم، نسیم دہلوی اور دہلی میں غالب و مومن و ذوق کے متبعین مثلاً قربان علی بیگ سالک، مہدی مجروح، ظہیر دہلوی، زکی دہلوی، انور دہلوی، حسن بریلوی اور امیر مینائی اور داغ کے پیروکار ــــــ ان میں سے چند شعراء کے دواوین سے گزرنے کی کوشش کریں تو موضوعات، تلازمات،

تشبیہات و استعارات کی تکرار اتنی ملال انگیز ہے کہ انھیں تا دیر برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بقولِ حالی:

> اگر تمام فارسی اردو غزلیات کا خلاصہ کیا جائے اور مکررات کو چھوڑ کر محض اصلی مضامین چھانٹے جائیں تو سوسوا سو صفحے سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی۔ (۶)

اس سے قبل وہ مقدمہ ہی میں لکھ چکے ہیں:

> شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلہ اصول مسلمہ کے ہو گئے ہیں انھی کو ہمیشہ بہ ادنیٰ تغیر باندھتا رہے اور ان سے سر مو تجاوز نہ کرے۔ (۷)

'مقدمہ' میں اس سے اگلے تین صفحوں میں قدیم مضامین کی تکرار تفصیل سے فراہم کی گئی ہے جس سے غزل کی تنگ نائے کا پورا خاکہ فراہم ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر غزل کی اصلاح کے لیے متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ حالی نے درست لکھا ہے کہ غزل کی اصلاح اس لیے ضروری ہے کہ یہ مقبول ترین صنفِ شعر ہے لیکن اس کی اصلاح آسان نہیں کیونکہ اصلاح کے بعد اس کی عام دلفریبی کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ پھر انھوں نے غزل کی اصلاح کے لیے متعدد مشورے دیے ہیں جن میں اوّل مشورہ موضوعات کے دائرے کو وسیع کرنے کا ہے۔ مثلاً عشقیہ شاعری کی حدود کو پھیلانا، خمریات کے الفاظ کو استعاراتی انداز میں استعمال کرنا، ہر قسم کے خیالات جو دل میں پیدا ہوں انھیں شعر میں باندھنا، دنیا بھر میں جو نوع بہ نوع حالات، علوم، ایجادات آتی چلی جا رہی ہیں انھیں شعر میں منتقل کرنا غزل کی موضوعاتی وسعت کے لیے بہت ضروری ہے۔ حالی یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اخلاقی مضامین کو موثر شعر بنانا بہت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں، اس لیے شعراء کو ادھر بھی توجہ کرنی چاہیے۔ موضوعات کے بعد اسلوبِ غزل میں اصلاح کے لیے بھی انھوں نے بہت سے مفید مشورے دیے ہیں جن میں ایک ہی غزل میں متضاد مضامین سے پرہیز، تسلسل اشعار کی طرف رجوع، ایسا طریقہ اظہار اختیار کرنے کا مشورہ جس سے زبان اور بیان وسعت پذیر ہوں۔ انھوں نے درست کہا ہے کہ اوّل اوّل نئے پیرایہ ہائے بیان مقبول نہیں ہوں گے لیکن رفتہ رفتہ انھیں قبول کر لیا جائے گا۔ غیر مانوس الفاظ کو رفتہ رفتہ بڑھانا چاہیے۔ کچھ عرصے میں یہ غزل کا جزو بن جائیں گے اور ان کی اجنبیت کم ہو جائے گی۔

حالی کے عہد سے لے کر آج تک غزل گو شعراء نے ان مشوروں پر دانستہ یا نادانستہ عمل کیا ہے۔ اکبر اور اقبال کی غزلیں حالی ہی کے مشوروں سے کلاسیکی غزل سے مختلف ہوئی ہیں۔ فراق، یگانہ چنگیزی، شاد عارفی کی غزلوں میں غیر غزلیہ الفاظ کی کثرت بھی حالی کی اسی تلقین کے سبب ہے۔ ذرا بعد کے شعراء میں مجید امجد، ظہیر کاشمیری، عزیز حامد مدنی، بیدل حیدری، انجم رومانی، تنویر سپرا، مصطفیٰ زیدی، ظفر اقبال، شکیب جلالی، جون ایلیا، ناصر شہزاد وغیرہ کے ہاں اسالیب و ذخیرۂ لفظی کے نوع بہ نوع تجربات حالی کے انھی اقدامات کا بالواسطہ یا بلاواسطہ نتیجہ ہیں۔

حالی نے **مقدمہ شعر و شاعری** میں غزل کے موضوعات و اسالیب میں تبدیلیوں کے جو مشورے دیے،

سب سے پہلے خود اُن پر عمل کر کے دکھایا۔ ان کی غزل کے موضوعات میں خاصی جدتیں اور نیا پن ہے۔ بہت سے اشعار میں روایتی مضامین کے اندر جدت پیدا کی گئی ہے۔ علامات اور تلازمات کے سلسلوں کو وسیع کیا گیا ہے۔ غزل میں پہلی بار سماجی مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں کے ہاں جاگیرداری دور نے جو خرابیاں پیدا کر دی تھیں اور جنھوں نے پورے سماجی ڈھانچے کو زوال کی گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا، اس کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جاگیردارانہ رسوم و رواج سے معاشرے کی ایک مخصوص ذہنیت بن گئی تھی۔ اشرافیہ کا ایک خاص رہن سہن اور طرزِ بود و ماند تھا جس سے سوسائٹی کا ایک اجتماعی مزاج بن چکا تھا، اس غزل میں سوسائٹی کے ان زوال پذیر معتقدات کا خاکہ اڑایا گیا ہے یا ان پر طنز وتعریض کے تیر برسائے گئے ہیں۔

انگریزوں کی آمد کے ساتھ جو نئے سماجی اور سیاسی تغیرات ہو رہے تھے ان کے نتیجے کے طور پر طبقہ اشرافیہ کا زوال نمایاں ہونے لگا تھا۔ وہ قرضوں کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔ ان کی جائیدادیں بک چکی تھیں یا ضبط ہو چکی تھیں اور انگریز جس طرح ہندوستان کی زرعی پیداوار سے انگلستان کو متمتع کر رہے تھے، یہ سب کچھ حالی نے اپنی غزل میں بیان کر دیا ہے۔

متناسب ردیفیں اور غیر مردف غزلیں خاصی بڑی تعداد میں ہیں جن سے غزلوں میں موڈ کی وحدت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے الفاظ خاصی تعداد میں استعمال کیے ہیں جو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں سمجھے جاتے۔ بول چال کے ٹھیٹ الفاظ اور محاورات باندھے ہیں جو اب تک ٹکسال باہر قرار دیے جاتے تھے اور اس طرح غزل کی فضا تبدیل کر دی ہے اور اسے اپنے دور سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

ان سب تبدیلیوں پر ایک ایک کر کے بحث کرنا ایک مختصر مضمون کی حدود سے باہر ہے۔ میں چند تبدیلیوں کی نشاندہی معدودے چند مثالوں سے کروں گا اور جہاں ناگزیر ہو گا وہاں مختصر تبصرہ بھی کروں گا۔

سب سے پہلے سیاسی علامتوں کو لیجیے۔ حالی کے زمانے میں انگریزوں پر براہِ راست وار کرنا جان گنوانے یا قیدِ بامشقت کی صعوبتیں برداشت کرنے کا نام تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے قیام کے چند سال بعد تنقید کرنا ممکن ہوا۔ حسرت، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں نے حالی سے مختلف فضا دیکھی اس لیے انھوں نے کھلی تنقید کا انداز اپنایا لیکن حالی نے علامتوں کے ذریعے انگریزوں کے ظلم وستم، استحصال، جبر و استبداد، دیسی اور انگریزی لوگوں میں عدمِ مساوات اور نسلی کمتری اور برتری کی تفاوت کا نقشہ کھینچا۔ چند اشعار دیکھیے:

یاں ہے جلّاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص | درد، اور درد کی ہے سب کے دوا، ایک ہی شخص

ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص | قافلے گزریں وہاں کیونکے سلامت واعظ

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن

خُدا محافظ ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

جہاں ہو راہزنِ خلق رہنما ایک ایک | سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں

راہبر، راہزن، جلّاد، قافلہ، راہنما وغیرہ وہی علامتیں ہیں جو ہماری غزل میں بعد ازاں کتنے ہی شعراء نے

استعمال کیں خصوصاً ترقی پسند شعراء نے ان سے بہت مدد لی۔

بدلے ہوئے حالات، انگریزوں کا خوف، اقتصادی لوٹ مار، خام مال کو مُنہ مانگے داموں جبراً خریدنا، مقامی صنعت و حرفت کو تباہ کرنا اور ایسے دوسرے حالات حالی کے ہاں علامتوں، اشاروں اور کنایوں میں ظاہر کیے گئے ہیں:

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ
برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

(ٹڈیاں - انگریز کی علامت ہے)

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمھارا

لطف و کرم طنزیہ ہے بہ معنی ظلم و ستم۔

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا دیکھ کے اسکو سارے تمھارے آ گئے یاد احسان ہمیں
ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی خطا سے احسان اس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

مسلمانوں کا زوال، بدترین اقتصادی اور سماجی حالات، ہندو مسلم اختلافات وغیرہ کی طرف اشارے ان کی غزلیات میں جگہ جگہ موجود ہیں:

مسلمانوں کے زوال اور حالات کے منقلب ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیے سوارو ہے لاکھ لاکھ من کا اک اک قدم تمھارا
یوں تو آیا ہے تباہی پہ یہ بیڑا سو بار پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

مگر حالی درسِ رجائیت بھی دیتے ہیں جو سرسید تحریک کا فیضان ہے:

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے گزرا ابھی ہے یاں سے خیل و حشم تمھارا

ہندو مسلم اختلافات کے بارے میں یوں اشارہ کرتے ہیں:

کبک و قمری میں یہ جھگڑا ہے چمن کس کا ہے کل خزاں آ کے بتا دے گی وطن کس کا ہے

ہندوؤں کا ترقی کی دوڑ میں آ گے نکل جانا:

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

مسلمانوں کا زوال پذیر جاگیرداری دور میں فرسودہ اقدار کو ترک نہ کرنا، زوال کا باعث بننے والی عادات کو اپنائے رکھنا، حقیقت پسندی کی بجائے شیخی، تکبر، منافرت، تضحیک، منافقت، لالچ اور اس طرح کے دیگر امراض میں مبتلا رہنا اور انھیں امراض ہی نہ جاننا وغیرہ جیسی عادات بد پر کبھی حالی نے طنز کے تیر برسائے ہیں اور کبھی براہِ راست مذمت کی ہے:

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
افسوس اہلِ دیں بھی مانندِ اہلِ دنیا خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

(مطلب یہ ہے کہ قوم کے پاس دروغ گوئی کے سوا کچھ نہیں رہا)

شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں نفسِ کبر اتنا ہی یاں نشوونما کرتا رہا
منہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں ان سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

(عسکری صاحب اس شعر کو غلط سمجھے ہیں یہ سماج پر طنز ہے نہ کہ حالی کا اپنی ذات پر تبصرہ)

جب دیکھیے حالی کو پڑا پایئے بیکار کرنا اسے باقی یہی اک کام ہے گویا

ذیل میں ایک غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو مسلم اشرافیہ کا حقیقی نقشہ پیش کرتے ہیں:

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیز گار عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں نہ اس کے آشنا گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سُن پاتے ہیں ہم کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر
کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر
ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر
خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوئے شر
بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

ہوسکتا ہے کوئی اسے شاعری نہ سمجھے مگر اس میں غزل کی نکتہ آفرینی مناسب انداز میں جلوہ گر ہے۔ شاعری کی کوئی تعریف ہر طرح کی شاعری کا احاطہ نہیں کرتی۔ میرے نزدیک یہ غزل ہمارے معاشرے کا نقشہ بڑے اچھے انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس طرح کی معاشرتی خرابیاں ہمارے ہاں آج بھی پوری طرح موجود ہیں اس لیے یہ سماجی تنقید کے اظہار کا عمدہ طریقہ ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ حالی نے ردیف و قافیہ کی پابندیوں کو نرم کیا۔ بے میل ردیف و قافیہ والی زمینوں کو ترک کر دیا تا کہ غزل کا تصنع ختم ہو اور وہ جذبات کی ترجمانی کرے نہ کہ صنعت گری سے مرعوب کرے۔ انھوں نے تغزل سے بھی انحراف کیا جس کی رو سے غزل میں الفاظ و تلازمات کو بہت محدود کر دیا گیا تھا۔ عربی اور فارسی تراکیب و الفاظ کی بجائے بول چال اور مقامی بھاشاؤں کے لفظوں کو شامل کیا اور کسی لفظ کو اچھوت قرار دینے کی بجائے یہ نظریہ پیش کیا کہ موقع محل کی مناسبت سے ہر لفظ فصیح ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اوّل آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبر یاں — جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

....

کاوش میں ہے الٰہی دگدا میں ہے طبیعی — جو حل ہُوا نہ ہو گا وہ ہے سوال تیرا

....

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں — جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

....

ادھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بِسوے ہر جائے گی
وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر — تماشے دیکھے ہیں ہم نے یہ بارہا اے شیخ

....

نشے میں چُور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں — پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے

....

ہم سے خود دنیا ہی پتیائی نہ حالی ورنہ یاں — دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

اس طرح کے درجنوں الفاظ اور محاورات حالی کی غزلیات میں موجود ہیں۔ حالی کے ہاں ایسی غزلیں یقیناً ہیں جن میں براہِ راست تلقین اخلاق ہے، ایسے اشعار میں نثریت ہے اور کوئی لطف نہیں مگر یاد رکھیے غزل میں اتنا بڑا تحول پہلی دفعہ کیا جا رہا ہے اس لیے کامیاب تجربات کے ساتھ ناکام اشعار بھی مل جائیں تو ان پر گرفت نامناسب ہے۔ ویسے بھی کسی لکھنے والے کا مرتبہ اس کی کامیاب تخلیقات سے متعین کیا جاتا ہے نہ کہ ناکامیوں اور خامیوں سے۔ میر اگر آج اردو غزل کے بہترین شاعر سمجھے جاتے ہیں تو اپنے ہزار ڈیڑھ ہزار موثر اشعار کی بنا پر نہ کہ سولہ ہزار معمولی اشعار کی وجہ سے۔ بدقسمتی سے ہمارے نقادوں کو اس بات کا شعور نہیں کہ کسی تخلیق کار کو پڑھتے ہوئے اس کے ہاں خار چینی کی بجائے گل چینی کرنی چاہیے ورنہ بڑے سے بڑا لکھنے والا نہیں بچے گا۔ نقاد کو منصف ہونا چاہیے نہ کہ مدعی کا وکیل۔ اسے ایسا منصف نہیں ہونا چاہیے جو شک کا فائدہ تخلیق کار کو دینے کی بجائے اسے اپنے کھاتے میں ڈال لے۔

مسدس مدو جزرِ اسلام ۱۸۷۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی جب حالی اینگلو عربک سکول دہلی میں پڑھاتے تھے اور سرسید سے ان کا رابطہ بڑھ چکا تھا۔ سرسید ہی کے مشن کو مسدس میں آگے بڑھایا گیا ہے مگر بڑی دردمندی، بڑے اخلاص اور نہایت عمدگی کے ساتھ۔ اردو میں مسدس سے پہلے کوئی قومی نظم نہیں لکھی گئی۔ یہ طویل نظم ہے اولیں اشاعت میں اس کے دوسو پچانوے (۲۹۵) بند تھے۔ بعدازاں ۱۸۸۶ء میں ایک سو باسٹھ (۱۶۲) بندوں کے ضمیمے کا اضافہ کیا گیا۔ بعض جگہ کچھ لفظی تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ اس طرح اب مسدس چار سو ستاون (۴۵۷) بندوں یعنی تیرہ سو اکہتر (۱۳۷۱) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے خلاف اور حق میں بہت کچھ لکھا گیا بلکہ اس کے جواب میں مسدس ہئیت ہی میں کئی نظمیں لکھی گئیں مگر سب برسات کے سبزے کی طرح فنا ہو گئیں۔ حالی کی نظم البتہ

زندہ رہی اور پہلے علماء اور بعد ازاں ترقی پسند نقادوں کی مخالفت کے باوصف پہلے سے کمتر مگر اب بھی مقبول ہے۔

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> دنیائے ادب میں ارتداد کی تین مثالیں عبرت ناک ہیں۔ ٹالسٹائی نے افسانہ نگاری چھوڑ کر اخلاق، مذہب اور سیاسیات میں پناہ لینی چاہی اور کہیں کا نہ رہا... دوسری مثال ملٹن کی ہے جبکہ وہ شاعری کو طاق میں رکھ کر سیاسیات کے میدان میں چلا آیا اور نثر نگاری اختیار کی... حالی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ (۸)

یہ سنسنی خیز تنقید ضرور ہے لیکن مسدس کے ساتھ سخت ناانصافی کی مرتکب ہوئی ہے۔ کوئی طویل نظم ایسی نہیں ہوتی جس کے تمام حصے یکساں طور پر فنی بلندی کے حامل ہوں۔ ان میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ حالی کی مدو جزر سے بہت مختصر ہیں لیکن ان میں بھی معیار کی بلندی و پستی موجود ہے اس لیے اگر کچھ حصے کمزور ہیں تو متعدد حصے فنِ شعر کی رو سے بہت بلند ہیں۔ طویل نظم پر غزل کے اشعار کا انطباق نہیں کیا جا سکتا۔ نظم میں ایک شعر یا بند دوسرے سے مربوط ہو کر تاثر پیدا کرتا ہے۔ غزل کی طرح نہیں کہ کہیں اچھا شعر آ گیا اور کہیں بُرا۔ اچھے شعروں کو چُن لیجیے اور خراب شعروں کو چھوڑ دیجیے۔ طویل نظم شروع سے آخر تک طالب توجہ ہوتی ہے اور یہی صورت مسدسِ حالی کی ہے۔

مسدس ایک مربوط نظم ہے۔ تمہید میں شاعر نے بتایا ہے کہ ایک جہاز گرداب میں پھنسا ہے۔ جس کا بچنا محال ہے لیکن جہاز میں سوار لوگ سوئے ہوئے ہیں یہی کیفیت آج کے مسلمانوں کی ہے۔ دینِ اسلام نے عرب سے طلوع ہو کر وہاں کی رسوم جاہلیت کو مٹانے کے بعد اپنے عقائد کو دنیا میں پھیلایا اور علوم وفنون کے ذریعے سماجی ترقیات حاصل کر کے انھیں دنیا کے ممالک میں پہنچایا۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی حکومتیں نہ رہیں لیکن ان کے آثار دنیا بھر میں اب بھی موجود ہیں۔ ان کے علوم وفنون، فلسفہ اور سائنس دنیا میں پھیل گئے جنھوں نے یورپ کی قرونِ مظلمہ کو روشن کیا۔ لیکن جب زوال آیا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ علم و ہنر کے سرچشمے ختم ہوئے، حکومتیں جاتی رہیں اور اب مسلمان ہر قسم کے اخلاقی عیوب کا شکار ہیں۔ اشرافیہ مفلوک الحال ہے۔ تجارت جاتی رہی ہے۔ تعلیم ختم ہو گئی ہے اور اگر ہے بھی تو پُرانی بے فائدہ تعلیم باقی ہے۔ محنت کا شوق نہیں رہا۔ آنے والے زمانے کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ مکر، جھوٹ، بے غیرتی، ناداری، قرض خواہی کا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ سلاطین کی اولاد ادنےٰ درجے کی مزدوری کر رہی ہے۔ علماء مسجدوں میں بیٹھ کر حیلے بہانے سے گداگری کرتے ہیں۔ امیروں کے ندیم خوشامد کا ہنر جانتے ہیں اور بس۔ جن کے پاس کچھ دولت ہے وہ عیش و نشاط میں ضائع کر رہے ہیں۔ حقیقی اسلامی تعلیمات کو فراموش کر چکے ہیں۔ انسان دوستی رخصت ہو چکی ہے۔ قاضی، مفتی، صوفی، مُلّا ننگ اسلاف ہیں۔ پیری مریدی ٹھگنے کا بہانہ ہے۔ علماء نفرتیں بڑھاتے ہیں اور دین کو بہت محدود کر چکے ہیں۔ فرقہ پرستی عام ہے۔ عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ تکبر، خوشامد، دغا، نمود ونمائش، مکر و ریا ان کا چلن ہے۔ جو لوگ پرانے علوم وفنون پڑھتے ہیں وہ پرانی باتوں سے انحراف کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ ہر شخص کو شاعری کا خبط ہے اور کام کرنے کی بجائے نادیدہ محبوباؤں کے

فراق میں شعر کہتے رہتے ہیں۔ شرفاء کی اولاد بے ہودہ مشغلوں میں مبتلا ہے۔ کیا یہی نسلیں ہیں جو اسلام کو زندہ کریں گی؟ یہ جہاز گرداب سے نکلتا نظر نہیں آتا۔ انگریزی دور میں ہر شخص کو شخصی آزادیاں میسر ہیں، جدید علوم آ چکے ہیں لیکن اگر ان کے حصول کی خواہش نہیں ہے تو پھر ترقی کیسے ہوگی؟

ضمیمۂ مسدس کے بہت کم حصّے فنِ شاعری کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ اس میں بنیادی خیال یہ ہے کہ قوم بالکل ختم نہیں ہوئی۔ احساسِ زیاں ہو چلا ہے۔ انھیں ہمت اور محنت سے کام لینا چاہیے۔ شاید کچھ بہتری ظاہر ہو۔

اصل مسدس کے بہت سے ٹکڑے نہایت اچھے ہیں۔ نعتیہ حِصّہ لاجواب ہے۔ محمد حسن عسکری کی اس پر تنقید ناروا بلکہ دل آزار ہے۔(۹) آغاز میں گرداب میں پھنسے ہوئے جہاز کی علامت موثر طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی ترقیوں کا بیان بھی اکثر جگہ بڑا متاثر کُن ہے۔ زوال کے مرقعے عبرت ناک ہیں۔ کہیں طنز و تعریض کے ذریعے اور کہیں حقائق کی مدد سے احساسِ زیاں پیدا کرتے ہیں۔ علماء اور شعراء کے مضحک خاکے بے مثال ہیں۔ انھی دو مقامات سے چند بند درج کرتا ہوں:

علماء کا طریق و روش یہ ہے

کوئی مسئلہ پوچھنے ان سے جائے ۔۔۔ تو گردن پہ بار گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے ۔۔۔ تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے
کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھُلاتے ۔۔۔ کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں مُنہ میں لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں ان کو بتاتے ۔۔۔ کبھی مارنے کو عصا ہیں اٹھاتے
ستوں چشمِ بد دور ہیں آپ دیں کے!
نمونے ہیں خلقِ رسولِ امیں کے!

اس طرح کے کئی بند اور بھی ہیں۔ شعراء کا مرقع بھی دیکھ لیجیے۔ ماشاءاللہ پاکستان میں آج بھی ہر تیسرا شخص شاعر ہے:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر ۔۔۔ عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بڑھ کر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ۔۔۔ مَلَک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علمِ دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا
بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے ۔۔۔ عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے ۔۔۔ مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

مسدس کے بعض حصے بہترین بیانیہ شاعری کے نمونے ہیں۔ تفصیلات کو معتدل طریقے سے بیان کیا گیا ہے جس میں بے جا پھیلاؤ نہیں مگر ضروری جزئیات آ گئی ہیں خصوصاً وہ حصّہ جس میں مسلمانوں کی علمی ترقیوں کا تذکرہ ہے۔ مزید مثالوں سے قطع نظر کرتا ہوں۔

بطورِ نظم نگار حالی کی اہمیت ان کی دیگر حیثیتوں سے کم نہیں ہے۔ اردو نظم کی تاریخ میں حالی سے قبل صرف نظیر اکبر آبادی اہم نظم نگار ہیں جن کے ہاں موضوعات کی وسعت ہے اور پابند ہیئتوں کو برتنے کا سلیقہ ہے مگر یہ روایت آگے نہ چل سکی۔ حالی پون صدی کے وقفے سے آئے مگر انھوں نے نظم نگاری کی روایت کا احیاء بڑی عمدگی سے کیا۔ لاہور میں ۱۸۷۴ء سے جن نظموں کا سلسلہ انھوں نے شروع کیا تھا ان میں سے دو نظمیں یعنی 'برکھارت' اور 'حبِ وطن' متوجہ کرنے میں کامیاب رہیں۔ دِلّی جا کر انھوں نے چند برسوں میں بہت سی نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں اچھی خاصی طوالت کی حامل ہیں۔ ان میں فنی نقطۂ نظر سے 'کلمۂ حق' بہت اچھی نظم ہے جو ۱۸۸۳ء میں لکھی گئی۔ اگلے سال 'مناجاتِ بیوہ' تحریر کی جس کو ہر نقاد نے بہت سراہا ہے۔(۱۰) ہندی بحر اور مقامی الفاظ کی مدد سے اس میں تاثیر بھر دی گئی ہے۔ عربی اور فارسی کی بھاری بھرکم تراکیب کی بجائے ہریانوی اور برج بھاشا کے مروجہ الفاظ سے بہت کام لیا گیا ہے۔ ناخواندہ بیوہ عورتوں کے جذبات کی پیشکش کا یہ موزوں ترین اسلوب تھا۔ حالی نے نظموں کے لیے قطعے کی ہیئت بھی اختیار کی ہے ان میں بعض قطعات کامیاب ہیں۔ ان میں اکثر جگہ اخلاقیات کی تعلیم براہِ راست دی گئی ہے لیکن بعض جگہ طنز و مزاح اور ہجوِ ملیح نے انھیں دلکش بنا دیا ہے۔

مضمون کے شروع میں حالی کی بعض دیگر قابلِ ذکر نظموں کے نام گِنوا دیے گئے ہیں۔ ان کی تکرار نامناسب ہے۔ تاہم ان نظموں میں ترکیب بند بعنوان 'شکوۂ ہند' اس لیے توجہ طلب ہے کہ اقبال نے بعد میں اس نقطہ نظر کو پر زور انداز میں پیش کیا۔ یعنی اسلام ایک سادہ مذہب تھا اور عام لوگوں کی فلاح کے لیے آیا تھا لیکن غیر اسلامی عناصر کی آمیزش نے اسے پیچیدہ بنا دیا اور عام لوگوں سے دور کر دیا۔ دورِ آخر کی نظموں میں 'چپ کی داد' (۱۹۰۶ء) خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ 'مناجات بیوہ' اور 'چپ کی داد' میں عورتوں کے حقوق کے لیے بڑی مضبوطی مگر دردمندی سے آواز بلند کی گئی ہے۔ سرسید تحریک میں حالی واحد شخص تھے جو حقوقِ نسواں کے علمبردار تھے۔

اس مضمون کے آغاز میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا شاید ممکن نہیں کہ حالی بطورِ شاعر زیادہ اہم ہیں یا بطورِ نثر نگار۔ اس مسئلے پر کوئی رائے دینے کی بجائے بہتر ہوگا کہ میں ان کی نثری خدمات پر بھی مجملاً روشنی ڈالوں اگرچہ یہ اجمال بھی پوری کوشش کے باوجود کم صفحات میں نہیں سمائے گا۔

حالی کی ابتدائی نثری کاوشوں کا سلسلہ غالبًا ان کی شعری کاوشوں سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی پہلی نثری تصنیف عربی میں تھی۔ انھوں نے نواب صدیق حسن خان کی ایک رائے کی تائید میں یہ رسالہ لکھا تھا لیکن ان کے استاد مولوی نوازش علی نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا کہ یہ ایک وہابی کی تائید میں لکھا گیا تھا۔ حالی پر اس کا اتنا بُرا

اثر ہوا کہ کچھ عرصہ تک انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ وہ زمانہ عیسائی، مسلمان اور آریہ سماجی مناظروں کا تھا۔ مناظرے زبانی بھی ہوتے تھے اور مناظراتی کتابیں بھی بڑی تعداد میں لکھی جاتی تھیں۔ حالی کی تربیت چونکہ مدرسوں اور مسجدوں میں ہوئی تھی اس لیے ان کی ابتدائی نثری تحریریں اسی فضا میں لکھی گئی تھیں لیکن وہ جلد ہی اس قسم کی تحریروں کو چھوڑ کر دیگر موضوعات کی طرف آ گئے۔ 'تریاق مسموم' اور 'تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے' کے نام باقی رہ گئے۔ اس زمانے میں اردو نثر کے علاوہ انھوں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نثر لکھی جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کافی استعداد حاصل کر چکے تھے۔

اُن کی قابلِ ذکر نثری کاوشوں کا سلسلہ لاہور میں شروع ہوا۔ گورنمنٹ بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر ہونے کی وجہ سے انگریزی سے ترجمہ ہونے والی کتابوں کی تصحیح کرتے کرتے مغربی تصانیف سے واقف ہو چلے تھے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ کتابیں علوم وفنون کی ہوا کرتی تھیں جن میں سائنسی اور غیر سائنسی ہر طرح کی کتابیں شامل تھیں چنانچہ وہ مغربی مصنفین کے اندازِ فکر اور طرزِ استدلال سے متاثر ہونے لگے۔ ۱۸۶۸ء میں جب وہ ابھی لاہور نہیں آئے تھے تو حکومت کے ایک انعامی اشتہار کو پڑھ کر فارسی زبان کے قواعد پر انھوں نے **اصولِ فارسی** کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو سکولوں کے طلبہ کی تدریس کے لیے تھی۔ اسے انعام اس لیے نہ ملا کہ یہ نصابی ضروریات سے بلند تر قرار دی گئی۔ یہ کتاب طویل مدت تک غیر مطبوعہ رہی جس کا تعارف پہلی بار شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے نومبر ۱۹۵۳ء کے رسالہ نقوش میں کرایا۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے جہاں سے پروفیسر حمید احمد خاں نے اس کی نقل مجلسِ ترقی ادب کے کتاب خانے میں محفوظ کر لی جو بالآخر ۲۰۰۹ء میں احمد رضا کی کوشش سے شائع ہوگئی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور اہم کام جو غالباً قیامِ لاہور میں حالی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، علم طبقات الارض پر ایک کتاب بعنوان **مبادی علم جیالوجی** کا اردو ترجمہ ہے جو فرانسیسی سے عربی میں کیا گیا تھا اور عربی سے حالی نے اسے اردو میں منتقل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کا قیام ۱۸۸۲ء میں عمل میں آیا۔ کتاب کے سرورق کے مطابق رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر لائٹز نے اسے ۱۸۸۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا۔ اس کی چند خستہ شکستہ جلدیں یونیورسٹی لائبریری میں اب تک موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ اسے محفوظ کیا جائے۔ اس کتاب کا موضوع خالص سائنسی ہے۔ حالی نے بہت عمدگی سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو بہت مشکل کام ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اورینٹل کالج لائبریری سے یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہوئی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے بارہ سال پہلے قائم ہوا تھا اور یہی زمانہ حالی کے قیام لاہور کا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سید عبداللہ اور اس دور کے دیگر بزرگوں سے سنا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے بعد اورینٹل کالج لائبریری یونیورسٹی لائبریری کا حصہ بن گئی تھی۔ امکان ہے کہ یہیں سے یہ کتابیں یونیورسٹی لائبریری میں پہنچ گئیں۔

۱۸۷۴ء کے آخر میں یا ۱۸۷۵ء کے شروع میں جب حالی نے اینگلو عربک سکول دہلی میں تدریس شروع کی تو سرسید اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کر چکے تھے۔ حالی نے اس زمانے سے علی گڑھ تحریک کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر مضمون نگاری شروع کی۔ جس کا اجمالی ذکر اس مضمون کے آخر میں کیا جائے گا۔

حالی کی نثری کاوشوں کو تین حِصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) سوانح نگاری (۲) مقدمۂ شعر و شاعری (۳) متفرق موضوعات پر متعدد نثری مضامین ــــ ان کے علاوہ ان کے مکاتیب کے دو مجموعے بھی ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔

سوانح نگاری کا سلسلہ **سفرنامہ حکیم ناصر خسرو** کی تدوین سے ہوا۔ ناصر خسرو (ولادت ۱۰۰۳ء– وفات ۱۰۸۸ء) بلخ میں پیدا ہوا۔[۱۱] فرقۂ اسماعیلیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جب اس نے اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کی تو علماء اس کے خلاف ہو گئے اور وہ جان کے خوف سے مارا مارا پھرا۔ اس نے بہت سے ممالک کا سفر کیا، کئی حج کیے اور بے شمار شدائد سے گزرا۔ یہ سفر نامہ اس کے مشاہدات و تجربات کا اظہار کرتا ہے اور اس کا نثری اسلوب بہت عمدہ ہے اور اس میں خلافِ عقل کوئی بات نہیں۔ حالی نے ۱۸۸۲ء میں اپنے قیام دہلی کے زمانے میں اس کی تدوین کی اور اس پر ایک جامع مقدمہ لکھا۔ بقولِ پروفیسر حمید احمد خاں:

> سوانح نگار کی حیثیت سے ان کی اولیت مسلم ہے ...اسی قبیل کا ایک مختصر رسالہ 'حالات حکیم ناصر خسرؒ' ہے جو حالی کے سوانحی شاہکاروں کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سوانح عمری 'سفرنامہ حکیم ناصر خسرؒ' کے ساتھ اس کے مقدمے کے طور پر ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ ناصر خسرو کا سفرنامہ فارسی زبان میں ہے اس لیے حالی نے صاحبِ سفر نامہ کی سیرت و حالات فارسی ہی میں قلمبند کیے ہیں۔ سفرنامے کے متن کی تصحیح کے علاوہ حالی نے ترتیبِ سوانح میں بے انتہا کاوش کی۔[۱۲]

اگرچہ اس سفرنامے کے مقدمے میں ناصر خسرو کا سوانحی خاکہ تیار کرنے میں حالی نے بڑی کاوش کی مگر اسے ان کی آنے والی سوانحی تصانیف کا ایک ابتدائی خاکہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

حیات سعدی حالی کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری ہے۔ جو ۱۸۸۶ء کے اوائل میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ سوانحی ہے اور دوسرا ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔ حالی نے اپنی بعد کی دونوں سوانح عمریوں میں بھی سوانح اور ادبی کارناموں کی دوئی برقرار رکھی ہے بلکہ شبلی نے بھی حالی کا یہ انداز اپنی تاریخی سوانح عمریوں کے لیے اپنایا ہے۔ سعدی کو موضوعِ سوانح بنانے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حالی کے مزاج کی سعدی سے کافی مشابہت تھی۔ سعدی کی حیثیت اسلامی دنیا میں مسلمہ تھی۔ کوئی دوسرا شخص شہرت میں ان کا حریف نہیں تھا۔ مدرسوں کے نصابات میں گلستان و بوستان کے برابر کی حیثیت دوسری کتابوں کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ ایک بچے سے لے کر ہشتاد سالہ بزرگ تک اپنے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق سب ان سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں معنویت اور اسلوب کی کئی تہیں ہیں جو بڑھتی عمر کے ساتھ زیادہ مرغوبِ طبع ہوتی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں سعدی فارسی غزل کی بنیاد ڈالنے والے تھے اور آنے والی غزل پر ان کے گہرے اثرات ہوئے۔ ان کی قصیدہ نگاری کا ایک خاص انداز ہے اور حمد و نعت میں بھی مشکل سے کوئی ان تک پہنچتا ہے۔ حالی نے اپنے زوال آمادہ دور کے لوگوں کے لیے مسلمانوں کی تاریخ ادب سے ایک ایسا شخص منتخب کیا جو ان کے لیے ایک ماڈل بن سکتا تھا۔

سعدی پر یوں تو بہت سی متفرق نویسی ہو چکی تھی لیکن کوئی قابلِ ذکر جامع سوانح عمری موجود نہیں تھی۔ حالی نے بڑی محنت سے مشرقی اور مغربی مآخذ سے استفادہ کیا۔ سعدی کی تصانیف سے داخلی شہادتیں بھی جمع کیں اور یوں ایک ایسی کتاب تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی بہت کچھ تحسین ہوئی۔ شبلی نے شعرالعجم کی جلد دوم میں جب سعدی پر لکھا تو حاشیے میں ذیل کی سطور تحریر کیں:

> مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔ (۱۳)

یہ شبلی کی راست گوئی اور عظمت ہے کہ انھوں نے واضح طور پر حیاتِ سعدی کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ سعدی پر لکھتے ہوئے حیاتِ سعدی کے اردگرد ہی گھومتے رہے۔

حیات سعدی کی تصنیف کو اس وقت ۲۰۱۵ء میں ایک سو انتیس (۱۲۹) سال گزر گئے ہیں۔ اس دوران سعدی کی سوانح پر کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ ایران میں البتہ بعض محققین مثلاً آقائے عباس اقبال، رضا زادہ شفق اور سلیم نیساری وغیرہ نے زیادہ تر داخلی شہادتوں کی مدد سے بعض مغالطوں کو دور کیا ہے جس سے **حیات سعدی** کی بعض تفصیلات پر بھی زد پڑتی ہے۔ خصوصاً سعدی کی تاریخ ولادت و وفات کا بہتر تعین کر کے ان کا زمانہ قدرے قطعیت سے طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالی نے سعدی کی عمر پر بحث کرتے ہوئے وفات کے وقت انھیں ایک سو چار (۱۰۴) سال سے زیادہ کا بزرگ قرار دیا ہے جب کہ اب ان کی وفات کا سال (۱۲۹۱ء)۶۹۱ھ مانا جاتا ہے اور یہی سالِ وفات ان کے مقبرے کے اندر لکھا ہوا ہے۔ (۱۴) عابد علی عابد مزید تحریر کرتے ہیں:

> سعدی نامہ کی اشاعت کے بعد جس میں آقا محمد قزوینی اور آقا عباس اقبال کے تحقیقی مقالات شامل ہیں اب مسلم ہو چکا ہے کہ سعدی کی ولادت ساتویں صدی ہجری کے پہلے بیس سال میں ہوئی۔ آقائے عباس اقبال نے اندرونی شہادت کی بنا پر اس دائرے کو مزید تنگ کر دیا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ سعدی کی ولادت ۱۲۱۳ء/۶۱۰ھ اور ۱۲۱۸ء/۶۱۵ھ کے درمیان واقع ہوئی۔ (۱۵)

اس طرح وفات کے وقت سعدی کی عمر ۷٦ سے ۸۱ سال کے درمیان ہوگی جو زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

حیاتِ سعدی کی بعض دوسری تفصیلات بھی غلط ثابت ہو چکی ہیں مثلاً سعدی کا ہندوستان آنا اور سومنات میں مقیم ہونا وغیرہ۔ اصل میں حکایات کا سو فیصد حقیقت پر مبنی ہونا ضروری نہیں ہوتا اور سعدی کے حالات زندگی میں بعض اغلاط اس لیے در آئی ہیں کہ حالی نے ہر حکایت میں واقعیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیاتِ سعدی کا دوسرا حصہ جو ان کے ادبی کارناموں سے بحث کرتا ہے، بے نظیر ہے اور اس سے آج کا قاری بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

حالی کی دوسری سوانح عمری یادگارِ غالب ہے جو حیات سعدی کے تقریباً گیارہ سال بعد ۱۸۹۷ء میں

شائع ہوئی۔ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا یعنی ان کی وفات پر اس وقت اٹھائیس سال گزر چکے تھے۔ حالی نے غالب کی سوانح لکھنے کا ارادہ برسوں پہلے کیا تھا مگر دیگر مصروفیات کی وجہ سے نہ لکھی جا سکی۔ بالآخر اتنا عرصہ گزرنے کے بعد تصنیف کی نوبت آئی۔ اس عرصے میں یقیناً غالب پر چند متفرق تحریریں شائع ہوئی ہوں گی۔ ان سے بھی حالی نے استفادہ کیا۔ وہ غالب سے ذاتی طور پر بھی واقف تھے اس لیے حیات سعدی کے برعکس اس میں ذاتی حوالوں سے بھی معلومات درج کی گئی ہیں۔ دوسرا حصہ حیات سعدی کی طرح غالب کے آثار کی تفصیلات مہیا کرتا ہے اور ان کے دقیق اشعار کی شرح کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ یہ حصہ بعد ازاں کلام غالب کی تفہیم کا اہم ذریعہ ثابت ہوا اور غالب کی عظمت کو عام لوگوں تک پہنچانے میں اس نے اہم ترین حصہ لیا۔

چونکہ رفتہ رفتہ غالب کو بہت بڑا شاعر مان لیا گیا اس لیے ان پر بہت تحقیق ہوئی۔ تنقید میں بھی ان کے نثری قصائد لکھے گئے اور ہجو یہ انداز بھی اختیار کیا گیا۔ ان کی زندگی کی تمام جزئیات پر تفصیلی نگاہ ڈالی گئی اس لیے یہ غلط فہمی پھیلا دی گئی ہے کہ یادگارِ غالب پر از اغلاط کتاب ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> حالی اس حالت میں یقیناً نہیں تھے کہ غالب کا زیادہ حال اپنے مشاہدے سے لکھ سکیں۔ انھوں نے یادگار کی تیاری میں غالب کے قریبی حلقہ احباب میں سے (جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں) بعض کے بیانات لیے لیکن پوری تگ و دو نہیں کی نتیجہ یہ ہے کہ 'احوالِ غالب' میں ان سے سینکڑوں غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔ (۱۲)

ڈاکٹر وحید قریشی بطورِ محقق جانے جاتے تھے لیکن یہ جملے پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ غالباً ڈاکٹر صاحب فراموش کر گئے ہیں کہ سینکڑوں کا مطلب کم از کم دو سو تو ہوگا۔ یادگارِ غالب کا سوانحی حصہ صرف ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حساب سے فی صفحہ کم از کم دو اغلاط ہونی چاہییں مگر جب ڈاکٹر صاحب غلطیوں کو گنوانے لگتے ہیں تو واقعی یا فرضی اغلاط کی تعداد اڑتیس تک ضرور بڑھا دیتے ہیں مگر بیشتر اغلاط یا تو سرے سے غلطیاں نہیں ہیں یا بہت معمولی ہیں یا حقائق کی بجائے محض ذاتی آرا پر مبنی ہیں۔

دراصل یادگارِ غالب کے بعد غالب پر بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں بجنوری کے نعرۂ مستانہ کے بعد عبداللطیف کے ہاں ۱۹۲۸ء میں اس کا ردِعمل بہت نامناسب انداز میں ظاہر ہوا۔ پھر غالب کو بے شمار اہلِ علم و تحقیق نے موضوع بنایا، وسیع اور گہری تحقیق کی۔ ایس-ایم-اکرام، مالک رام، غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مختار الدین احمد، پروفیسر نذیر احمد، گیان چند، کالی داس گپتا رضا وغیرہ کی وجہ سے سوانح غالب کی بے شمار تفصیلات سامنے آئیں۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر وحید قریشی قاضی عبدالودود سے بہت متاثر تھے۔ قاضی صاحب بڑے عالم آدمی تھے لیکن بہت منفی مزاج رکھتے تھے۔ ان کی یہ بات کون مانے گا کہ غالب کو فارسی نہیں آتی تھی اور حالی عربی سے ناواقف تھے۔ قاضی صاحب نے نکتہ چینی کے سوا کوئی ٹھوس کام تو کیا نہیں۔ ان کی وفات کو ابھی تیس سال گزرے ہیں مگر ان کے قارئین کی تعداد میں بہت کمی آ چکی ہے۔ میں نہایت دکھے ہوئے دل سے کہتا ہوں کہ خود وحید قریشی کا بہت سا تحقیقی کام قیاس و گمان پر مبنی ہے۔ جب کہ یادگارِ غالب کل بھی زندہ تھی اور آج بھی زندہ ہے۔

یادگارِ غالب کو بے شمار محققین نے خامیوں کے باوجود غالب پر بہترین کتاب قرار دیا ہے۔

ایس-ایم-اکرام کی رائے ہے:

> مرزا غالب کو شعراء کے تذکروں میں اس وقت جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی جب وہ ابھی پندرہ سولہ برس کے تھے لیکن ان کی دلفریب شخصیت اور شاعرانہ عظمت کو پہلی مرتبہ حالی نے ہی بے نقاب کیا جو علی گڑھ تحریک کا رکن رکین تھا اور جس کی تالیف یادگارِ غالب میں اس تحریک اور اس کے راہنماؤں کی میانہ روی، واقعیت پسندی، لفاظی اور لن ترانیوں سے اجتناب، یہ سب باتیں پوری طرح عیاں ہیں۔ (۱۷)

گیان چند نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> یادگارِ غالب میں سوانح ہے، شخصیت کا خاکہ ہے اور اردو و فارسی نظم و نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سوانح کے اعتبار سے یادگار کسی قدر تشنہ ہے لیکن حالی نے کچھ ایسی آنکھوں دیکھی باتیں لکھ دی ہیں جو کسی اور کے ذریعے سے ممکن نہ تھیں۔ اخلاق و عادات و خیالات کا باب جامع اور مفصل ہے۔ اس سے غالب کی ایسی دلکش اور عظیم شخصیت سامنے آ جاتی ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرح ہمیں بھی رہ رہ کر یہ ارمان ہوتا ہے کہ کاش ہم ان سے ملے ہوتے۔ (۱۸)

ڈاکٹر نیّر مسعود یادگارِ غالب کی اہمیت کو ذیل کے الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

> یادگارِ غالب مرزا غالب کی زندگی اور شخصیت کا پہلا بھرپور مرقع ہے بلکہ اس سے پہلے شاید اردو کے کسی شاعر کی اتنی منظّم روداد اور ایسی مکمل تصویر ہمارے سامنے نہیں آئی اور آج بھی جب غالب پر تحقیق کا کام بہت آگے بڑھ چکا ہے 'یادگارِ غالب' کا مطالعہ ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ (۱۹)

اسی محقق نے محولہ بالا مضمون میں چند اور سطور ایسی لکھی ہیں جن پر یادگارِ غالب کے نکتہ چینوں کو اچھی طرح غور کرنا چاہیے:

> یادگارِ غالب کی اشاعت کے بعد سے اب تک غالب پر جو خرد بینی تحقیق ہوئی ہے اس کے نتیجے میں حالی کی کچھ تحقیقات کا غلط ثابت ہونا ناگزیر تھا۔ اس خرد بینی تحقیق کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اپنے بارے میں خود غالب کے بہت سے بیانات غلط ثابت ہو گئے۔ حالی کے بیانات میں بھی بیشتر غلطیاں وہی ملتی ہیں جہاں انھوں نے غالب کے بیانات کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ (۲۰)

سچ تو یہ ہے کہ کسی شخص نے بھی اپنے بارے میں مختلف اوقات میں کچھ لکھا ہو تو ان میں تضادات بھی ہوں گے اور اغلاط بھی جس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ خود وحید قریشی صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ان میں بین تضادات، غلط بیانیاں اور پردہ پوشیاں شامل ہیں۔ اس سے شاید ہی کوئی بچ سکے۔ تضادات اور اخفائے معلومات کی تصحیح ضرور کی جائے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسی اغلاط اور تسامحات کو محدب عدسہ لگا کر اپنے

تناسب سے بڑا کر کے نہ دکھایا جائے اور نہ ہی اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے جارحانہ اسلوب اختیار کیا جائے۔

حالی کی سوانح عمریوں میں **حیاتِ جاوید** کا ایک منفرد مقام ہے۔ یہ ضخیم سوانح عمری ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ سرسید کا انتقال ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا تھا۔ حالی ان کی سوانح لکھنے کے ارادے سے مواد چند برسوں سے جمع کر رہے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے اس سلسلے میں زیادہ توجہ سے کام شروع کیا لیکن سرسید کی وفات کی وجہ سے یہ کام رک گیا۔ ان دنوں وہ بے شمار گھریلو مسائل و مصائب کا شکار بھی تھے۔ سرسید پر قلم اٹھانے کا معاملہ کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو گیا۔ انھوں نے اس زمانے میں کچھ متفرق نویسی ضرور کی مگر حیاتِ جاوید کے پھیلے ہوئے کام کو سمیٹنے کی کوشش عارضی طور پر ترک کر دی۔

مولانا شبلی نعمانی کو جب حیاتِ جاوید کا ایک نسخہ حالی نے مولوی عبدالحق کے توسط سے حیدر آباد بھیجا تو انھوں نے پڑھے بغیر اسے کذب و افترا کا دفتر قرار دیا۔ شاید پڑھنے کے بعد اسے کتاب المناقب، مدلل مداحی اور یک رخی تصویر کہا چنانچہ حیات جاوید کے بارے میں متعدد مباحث آج تک شبلی کے انھی الفاظ کے گرد گھومتے ہیں۔ سوانح عمریاں بالعموم مدلل مداحی ہی ہوتی ہیں۔ غیر مدلل مداحی تو عیب قرار دی جا سکتی ہیں مگر جب کوئی مداح کسی 'رجل' پر قلم اٹھائے گا تو وہ اس کی منفی باتوں کو اچھالنے سے تو رہا۔ خود شبلی نے بھی اپنی سوانح عمریوں میں یہ کام حالی سے بڑھ کر کیا ہے گو انھیں یہ سہولت حاصل ہے کہ ان کے موضوعاتِ سوانح ایسے اشخاص ہیں جن پر تنقید سے گریز کرنا سہل ہے۔

النعمان، الفاروق، سیرت النبیؐ، سیرت عمر بن عبدالعزیز اور سوانح مولانا روم میں بے تنقید گزر جانا یا ہلکی سی تنقید کر کے اعتراضات سے بچ نکلنا آسان ہے لیکن غالب اور سرسید پر یہی لوگ سخت تنقید کی توقع رکھتے ہیں۔ غالب اور سرسید حالی کے ہیروز تھے۔ وہ ان سے متاثر تھے یا ان کے بہت سے اعمال و افعال سے مطمئن تھے۔ ایسے میں وہ نرم اور معتدل تنقید ہی کر سکتے تھے اور یہی انداز انھوں نے اختیار کیا۔ غالب پر نرم لہجے میں انھوں نے بہت سی سخن گسترانہ باتیں لکھی ہیں۔ شراب خوری، جُوا اور بعض دیگر اخلاقی معائب کی طرف اشارے کیے ہیں اور جو لوگ حالی کے اسلوب کو سمجھتے ہیں وہ ان کی نرم خوئی کے اندر ایسے دیگر تنقیدی نکتے بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ یہی صورت **حیاتِ جاوید** کی ہے۔ یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ حالی کا سرسید تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ وہ اس کے رکنِ رکین تھے اس لیے ان سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ سرسید پر لکھتے ہوئے شبلی نعمانی یا اکبر الہ آبادی کا سا اسلوب اختیار کرتے تاہم **حیاتِ جاوید** میں کم از کم پندرہ بیس مقامات ایسے ہیں جہاں سرسید کی آرا سے اختلاف کیا گیا ہے لیکن چونکہ اسلوب میں دھیما پن ہے اس لیے قاری تنقید کو سمجھ نہیں پاتا۔ **حیاتِ جاوید** کے بارے میں بہترین تنقیدی جملہ ڈاکٹر عبدالحمید (سابق پروفیسر سیاسیات و تاریخ ــــ گورنمنٹ کالج لاہور) نے اپنے تھیسس کے دیباچے میں لکھا ہے:

> "It is fairly critical though the criticism is subdued and respectful"(۲۱)

یہ جملہ 'حیات جاوید' کی تنقید سرسید کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسیّد سمجھتے تھے کہ ''انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہرقسم کی علمی ترقی اس میں ہوسکتی ہے۔'' حالی ان کے اس نقطۂ نظر پر ذیل کے الفاظ میں شدید تنقید کرتے ہیں:

> مگر ۳۶ برس کے تجربے سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہوسکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔ (۲۲)

علاوہ ازیں یہ بھی لکھتے ہیں:

> بات یہ ہے کہ نفسِ تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک ان کی باگ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے۔ ایک سانچے سے ایک ہی سے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے۔ (۲۳)

یہ دونوں اقتباسات ہماری مروجہ جدید مغربی تعلیم پر تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سرسید کی 'تفسیرِ قرآن' کے بارے میں بھی انھوں نے دوٹوک لفظوں میں لکھا ہے کہ ''سرسید نے اس میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔'' (۲۴)

اگر معترضین تنقید سے یہ مراد لیتے ہیں کہ حالی سرسید کے بنیادی مقاصد کے خلاف لکھتے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ سرسید تحریک میں انھوں نے شمولیت ہی اس وجہ سے اختیار کی تھی کہ وہ اس کے مقاصد سے متفق تھے۔

حیاتِ جاوید کو تقریباً متفقہ طور پر اردو کی بہترین سوانح عمری تسلیم کیا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کے سوانحی حالات، ان کی تعلیمی، سیاسی اور ادبی خدمات اور ان کے دور کی مجموعی تصویرکسی اور کتاب میں اس سے بہتر نہیں بنائی گئی۔

گریہم بیلی نے اس سے پہلے انگریزی میں سرسید کی سوانح لکھی مگر وہ ایک خاکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جب کہ قاضی سراج الدین کا دعوی کہ انھوں نے اس قسم کا ایک مسودہ تیار کیا تھا جس سے حالی نے بہت فائدہ اٹھایا، محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

حیاتِ جاوید کی اشاعت کو ایک صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اس کے بعد سرسید پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تنقیدی زاویۂ نظر تو ہر کسی کا اپنا اپنا ہوتا ہے لیکن **حیاتِ جاوید** اتنی محنت، باریک بینی اور توجہ کے ساتھ لکھی گئی ہے کہ آج تک اس کے حقائق پر کوئی اضافہ نہیں ہوسکا بلکہ بعد میں کچھ لکھا گیا ہے وہ معلومات کے سلسلے میں **حیاتِ جاوید** کی تکرار ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے شبلی پرست ہونے کے باوصف اسے اردو کی بہترین سوانح عمری قرار دیا ہے۔ اردو کی مجمل یا مفصل ادبی تاریخوں میں سرسید پر جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر **حیاتِ جاوید** ہی کی عطا ہے۔

حیاتِ سعدی اور **یادگارِ غالب** کی اشاعتوں کے درمیان تقریباً گیارہ سال کا عرصہ حائل ہے۔ ان کے تقریباً وسط میں انھوں نے اپنے دیوان کی اشاعت کا ارادہ کیا لیکن چونکہ ان کے کلام میں روایتی ہیئتوں کے علاوہ غیر روایتی انداز و اسلوب اختیار کیا گیا تھا، اس لیے ان پر تنقید ہوتی تھی۔ اوّل اوّل اس جدت کو بدعت سمجھا گیا لیکن آخر بہت سے شعراء نے چراغ سے چراغ روشن کیے اور جدید شاعری کے ارتقا میں اس کا حصہ بہت نمایاں رہا:

غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

جب حالی نے دیوان کو مرتب کرنا شروع کیا تو ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اپنے نئے شعری تجربات کا جواز پیش کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے بہت غور وخوض کیا۔ فارسی اور عربی شاعری کے وسیع مطالعے کی مدد سے شاعری کی ماہیت جاننے کی کوشش کی۔ لاہور کے قیام نے انگریزی خیالات سے انھیں آشنا کیا تھا، ان سے بھی کام لیا۔ اچھی بُری اردو شاعری کا انھوں نے جتنا وسیع مطالعہ کر رکھا تھا اسے بھی پیش نظر رکھا اور جب 'دیوانِ حالی' کا مقدمہ لکھنا شروع کیا تو وہ ان کی توقع سے بہت زیادہ پھیل گیا۔ غرض ۱۸۹۳ء میں جب مقدمہ شعر و شاعری مع **دیوانِ حالی** شائع ہوا تو دیوان سے مقدمہ دوگنا زیادہ ضخیم تھا۔

اشاعت کے ساتھ ہی مقدمۂ شعر و شاعری اہم تر حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے خلاف اور حق میں بہت کچھ لکھا گیا اور آج تک لکھا جا رہا ہے۔ چونکہ خراب شاعری کی مثالیں زیادہ تر لکھنؤ کے دوسرے درجے کے شعراء سے لی گئی تھیں اس لیے **اودھ پنچ** نے طوفان اٹھا دیا۔ حسرت موہانی بھی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ دو تین سال تک فضا میں یہی آوازیں گونجتی رہیں۔ حالی کی زندگی میں مقدمے کے اور نہ ہی دیوان کے دوبارہ چھپنے کا موقع آیا۔ بعد میں جب ہوا پلٹی تو اب تک مقدمے کے کوئی ساٹھ ستر ایڈیشن نکل چکے ہوں گے۔[۲۵]

سچ تو یہ ہے کہ خود ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمے کی تدوین کر کے اس پر جو کچھ 'حالی کی تنقید' کے زیرِ عنوان لکھا ہے وہ بھی مذکورہ بالا گونجتی آوازوں کی صدائے بازگشت ہے۔ بقولِ سعدی:

دشمن ہمی کُند کہ تو کردی بدوستی

دنیا کی کسی بھی اہم کتاب کو اسی کے زمانۂ تصنیف میں رکھ کر پڑھنا چاہیے۔ اس کے بغیر اسے سمجھا نہیں جا سکتا۔ حالی نے جس زمانے میں 'مقدمہ' کے نظری مباحث تحریر کیے اس وقت مغربی تنقید سے کسی کو بھی واقفیت نہیں تھی۔ وہ خود بھی انگریزی سے ناآشنا تھے۔ انھوں نے تراجم کے ذریعے جو کچھ مغربی تنقید کے بارے میں سمجھا اور سوچا، اسے مقدمے میں پیش کر دیا۔ ان سے مغربی خیالات کے سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں لیکن انھیں کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ ان افکار تک براہِ راست رسائی رکھتے ہیں یا انھیں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ مغربی تنقید کے ارتقا میں مختلف نقادوں کی درجہ بندی کیا ہے اور نہ ہی انھیں اس کا ادعا ہے۔ انھوں نے بعض مغربی اصولِ تنقید کسی نہ کسی طرح اخذ کر لیے، انھیں عربی، فارسی اور اردو شاعری کے مطالعے کے بل بوتے پر سمجھنے کی کوشش کی۔ اہم بات یہ نہیں کہ انھوں نے کس اصطلاح کو غلط سمجھا یا صحیح سمجھا۔ اہم یہ ہے کہ انھوں نے جو وضاحتیں کی ہیں وہ کہاں تک صحیح یا غلط ہیں۔ اگر Simple, Sensuous and Passionate کا ترجمہ: سادگی، اصلیت اور جوش

کر دیا جو غلط ہے تو اصل بات یہ ہے کہ ان کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ کہاں تک صحیح یا غلط ہے۔ انھوں نے سادگی کو اضافی امر قرار دیا ہے، اصلیت کے سلسلے میں نیچرل اور اَن نیچرل کی طویل بحث کر کے اصلیت کے مفہوم میں بڑی لچک پیدا کی ہے اور گونجتے گرجتے الفاظ کی بجائے ظاہری سطح کے نیچے موجود ہونے والے جذبے کی شدت کو جوش سے تعبیر کیا ہے اور ان کے دلائل بہت مناسب ہیں۔

اسی طرح اچھے شاعر کے لیے فطری صلاحیت کے ساتھ ساتھ تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کی جو شرائط عاید کی ہیں وہ درست ہیں۔ انھوں نے اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ ہر موزوں طبع شخص اچھا شاعر بن سکتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام ہے جس وجہ سے شعراء کی اتنی کثرت ہے جو ترقی یافتہ ممالک میں نظر نہیں آتی۔ مقدمۂ شعر وشاعری میں شعر کے لیے اخلاقیات کی جو پابندیاں لگائی گئی ہیں وہ اپنے زمانے کے معاشرتی انحطاط کی وجہ سے ہیں جب شاعری تکرارِ مضامین، سراپا نگاری اور مبتذل خیالات کے اظہار تک محدود ہوگئی تھی۔ یہ زمانہ آتش و ناسخ کے شاگردوں کی غزل سرائی کا تھا یا داغ و امیر کے متبعین کا۔ اس طرح کی شاعری کا بھرم انھوں نے کھول کے رکھ دیا ہے اور سچی شاعری کے آغاز کا راستہ دکھا دیا ہے۔

کلیم الدین احمد، ڈاکٹر وحید قریشی، سلیم احمد اور اس قسم کے کئی نقاد جملہ بازی اور جملہ سازی کو تنقید سمجھتے ہیں اور اپنے وسیع مطالعے کے باوجود کسی تحریر کو ہمدردی سے نہیں پڑھ سکتے جس کے بغیر صرف منفی تنقید ہی وجود میں آ سکتی ہے تاہم بعد کے نقادوں میں سے متعدد اہم نقادوں نے مقدمہ شعر و شاعری کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے تمام اگر مگر کے باوجود مقدمے کو اردو تنقید کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ احتشام حسین، آلِ احمد سرور، ممتاز حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر حمید احمد خاں، شوکت سبزواری، عزیز احمد جیسے ممتاز نقادوں نے مقدمے کی اہمیت کو دل سے مانا ہے۔ مقدمے پر تنقید کرنے والے بھی گزشتہ سوا سو سال میں مقدمے سے بہتر نظری تنقید کی کوئی کتاب تحریر کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ مقدمے کا جو حصہ اصنافِ شاعری کی اصلاح کے بارے میں ہے وہ لاجواب ہے اور بعد کی شاعری کا ارتقا انھی خطوط پر ہوا ہے۔ آخر میں وارث علوی کی کتاب 'حالی، مقدمہ اور ہم' سے ایک اقتباس پیش کر کے مقدمے پر اپنی گزارشات کو ختم کروں گا۔ وارث علوی کی شہرت ایک سخت گیر نقاد کی ہے لیکن مقدمے پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پوری ہمدردی، غور وخوض اور سچائی سے لکھا ہے۔ اس کتاب کو پوری طرح پڑھنے سے مقدمۂ شعر و شاعری کی صحیح تفہیم ہوسکتی ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ معلمین اور متعلمین اس کا مطالعہ توجہ سے کریں۔

اس کتاب سے ایک اہم نکتہ درج کرتا ہوں۔ توقع ہے کہ فتح محمد ملک سے لے کر ہمارے بہت سے نوجوان اور ادھیڑ عمر نقاد اس پر غور کریں گے:

> ایلیٹ نے ایک جگہ کہا ہے کہ بن جانسن پر تنقید کرتے وقت نقاد کو چاہیے کہ خود کو ذہنی طور پر بن جانسن کے لندن میں پہنچا دے نہ یہ کہ بن جانسن کو اپنے زمانے کے لندن میں کھینچ لائے۔ (۲۶)

اس نکتے سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ۱۸۵۷ء اور اس کے چند سال بعد کے زمانے کی ہولنا کیوں کو ہم بھول جاتے ہیں۔ جہادی تحریکوں کی ناکامی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور مسلم سماج کی مکمل تباہی کو ذہن میں نہیں لاتے اور وہ تحریریں جو سرسید کے رفقا بشمول حالی نے مصلحتاً لکھی ہیں، ان کو خوشامد کا نام دیتے ہیں حالانکہ موجودہ دور میں جب کہ حریتِ پسندی کی بہت کم قیمت دینی پڑتی ہے ہم معمولی فائدوں کے لیے برسرِ اقتدار افراد کی خوشامد شروع کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ سرسید ہوں، حالی ہوں یا محمد حسین آزاد، انھوں نے یہ سب کچھ اجتماعی مقاصد کے لیے کیا ہے اور اپنی ذات کے لیے ذرا سا فائدہ بھی نہیں اٹھایا جب کہ ہم سب کچھ اپنی ذاتی مفادات کے لیے کرتے ہیں۔

حالی افادی ادب کی حمایت بھی مصلحتِ وقت کی وجہ سے کرتے ہیں ورنہ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ فنونِ لطیفہ ہماری ذات کی بعض داخلی ضروریات کے لیے ہیں اور بہترین فنونِ لطیفہ میں افادیت کا ہونا لازم نہیں۔ مقدمہ شعر وشاعری کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> حکیم علی الاطلاق نے اس ویرانۂ آباد نما یعنی کارخانۂ دنیا کی رونق اور انتظام کے لیے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف قابلیتیں پیدا کی ہیں تا کہ سب گروہ اپنے اپنے مذاق اور استعداد کے موافق جدا جدا کاموں میں مصروف رہیں اور ایک دوسرے کی کوشش سے سب کی ضرورتیں رفع ہوں اور کسی کا کام اٹکا نہ رہے۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سود مند نہیں معلوم ہوتے ... کسان اپنی کوشش سے عالم کی پرورش کرتا ہے اور معمار کی کوشش سے لوگ سردی گرمی مینہ اور آندھی کی گزند سے بچتے ہیں اس لیے دونوں کام سب کے نزدیک عزت اور قدر کے قابل ہیں لیکن ایک بانسری بجانے والا جو کسی سنسان ٹیکرے پر تنِ تنہا بیٹھا بانسری کی لے سے اپنا دل بہلاتا اور شاید کبھی کبھی سننے والوں کے دل بھی اپنی طرف کھینچتا ہے گو اس کی ذات سے بنی نوعِ انسان کے فائدے کی چنداں توقع نہیں مگر وہ اپنے دلچسپ مشغلے کو کسان اور معمار کے کام سے کچھ کم ضروری نہیں سمجھتا اور اس خیال سے اپنے دل میں خوش ہوتا ہے کہ اگر اس کام کو سلسلۂ تمدن میں کچھ دخل نہ ہوتا تو صانعِ حکیم انسان کی طبیعت میں اس کا مذاق ہرگز پیدا نہ کرتا۔(۲۷)

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فنونِ لطیفہ کی اہمیت سوسائٹی کے مادّی فائدے کی بجائے اس کی بالیدگی کے لیے ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مغربی تنقید کے چند جملے جو ہماری سمجھ میں آ جاتے ہیں یا ہم سمجھتے ہیں کہ سمجھ میں آ گئے ہیں، ان سے ہم من مرضی کے نتائج نکالنے لگتے ہیں۔ یہ ہماری تدریس کا بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم اپنے ادب کو یا تو پڑھتے نہیں یا توجہ سے نہیں پڑھتے اور مغربی اصطلاحات مستعار لے کر رعب ڈالنے لگ جاتے ہیں۔ یہی کچھ ہم بچوں کو سکھا رہے ہیں اسی لیے سب کچھ غارت ہو رہا ہے اور بہ مشکل کوئی شخص ایسا ملتا ہے جو غالب، اقبال، یاس یگانہ چنگیزی، راشد یا مجید امجد کو براہِ راست پڑھ کر سمجھ سکے۔

آخر میں حالی کی متفرق نثر کا بہت سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

انھوں نے سرسید تحریک کے مقاصد کو مدنظر رکھ کر سماجی اور مذہبی اصلاح کے لیے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے، تنقیدی مضامین اور مکاتیب بھی خاصی تعداد میں ہیں، نثر میں بعض جگہ خوبصورت انشائی انداز بھی اختیار کیا ہے جس کی عمدہ مثالیں زبانِ گویا، مقدمۂ مسدس حالی اور مقدمہ دیوانِ حالی ہیں۔ حالی کی عمومی نثر تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے لیے بے حد موزوں ہے۔ اس میں متانت، سنجیدہ استدلال اور تمثیل کے ذریعے دلکشی در آتی ہے ـــــ یہ نثر سرسید کی نثر کے قریب ہے مگر اس سے زیادہ ہموار ہے۔ حالی کے بعض اصلاحی مضامین بے مثال ہیں جن سے ان کے علم کی وسعت ظاہر ہوتی ہے اور مذہبی تعصّبات کی شدت کو کم کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ وہ علماء کے حلقوں میں بھی رہے ہیں، غالب جیسے آزاد خیال شخص کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں اور سرسید جیسے مجتہد کے بھی بہت قریب رہے ہیں لیکن ان کے اصلاحی مضامین میں توازن اور اعتدال ہر جگہ موجود ہے۔ کہیں بلند لہجہ نہیں، کہیں جوش اور جذباتیت نہیں، اپنے مقصد پر نظر رکھتے ہیں اور دھیمے انداز میں نتیجہ نکال کر قاری کے آگے رکھ دیتے ہیں اور زبان سے گویا یہ کہتے ہیں:

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بندِ این مباش کہ نشنید یا شنید

آخر میں ان کی نثر سے ایک اقتباس درج ہے جو دلکش اسلوب نثر کی نہایت عمدہ مثال ہے:

> بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے دلچسپ اور پرفضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے نہ خاردار جھاڑیاں تھیں، نہ آندھیوں کے طوفان تھے نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہوگئیں مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا۔ اس کی سرسبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوشنما پودوں پر سانپ اور بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جونہی اس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ و مار و کژدم نکل آئے۔ باغِ جوانی کی بہار اگرچہ قابلِ دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی نہ وصل کی لذت اٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا:
>
> پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
> اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے (۲۸)

چند سطروں کے بعد یہ سلسلہ یوں آگے بڑھتا ہے:

> بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اُسی ایک چکر میں پھرتے رہے

اور اپنے تئیں سارا جہان طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں:

شکست رنگِ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدانِ وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس سال سے ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چُور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا، دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں... لیکن وہ اولوالعزم آدمی، جو ان سب کا رہنما ہے، اسی طرح تازہ دم ہے، نہ اسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔

آن دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے (۲۹)

ظاہر ہے کہ یہ تمثیلی انداز سرسید تحریک اور اس سے حالی کی وابستگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس مقالے کا اختتام انگریزی کے قدرے غیر معروف مگر اہم شاعر اور نثر نگار والٹر سیوتج لینڈر (۱۷۷۵ء-۱۸۶۴ء) کی ایک اہم رائے پر کیا جاتا ہے:

شفاف لکھنے والے شفاف چشموں کی مانند اتنے گہرے دکھائی نہیں دیتے جتنے گہرے وہ درحقیقت ہوتے ہیں۔ گدلے چشمے زیادہ گہرے نظر آتے ہیں۔ (۳۰)

لینڈر کے ادب اور شخصیت کی حالی سے کچھ مشابہتیں ہیں۔ قارئین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس اقتباس کا حالی کی نظم و نثر سے کیا تعلق ہے؟

حواشی:

(۱) ترجمۂ حالی؛ الطاف حسین حالی (حالی نے ۱۹۰۱ء میں سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر اپنے حالات انھیں حیدر آباد دکن بھجوائے تھے اور عنوان 'ترجمۂ حالی' رکھا تھا۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اسے 'بیان حالی' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: **کلیاتِ نثر حالی**، جلد اول؛ مجلس ترقی ادب، لاہور (۱۹۶۷ء) ص ۳۲۸ تا ۳۴۵

(۲) **کلیاتِ نثر حالی**، جلد اوّل؛ دیباچہ ص ہ

(۳) ایضاً؛ ص ۳۳۷

(۴) ایضاً

(۵) دیوان حالی؛ **الطاف حسین حالی**، شائستہ پبلشنگ ہاؤس، کراچی (۱۹۸۸ء) (مقدمہ رشید حسن خاں) ص ۲

(۶) مقدمۂ شعر و شاعری؛ **الطاف حسین حالی**، مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی، مکتبہ جدید، لاہور (۱۹۵۳ء) ص ۲۲۴

(۷) ایضاً؛ ص ۱۶۹

(۸) **نقوش و افکار**؛ مجنوں گورکھپوری، صفیہ اکیڈمی، کراچی (۱۹۶۶ء) ص ۲۲۱

(۹) محمد حسن عسکری نے 'محسن کاکوروی' پر مضمون میں مسدس حالی کے نعتیہ حصے پر نامناسب اعتراضات کیے ہیں اور اسے نعت کی بجائے 'ہجی کھاتا' قرار دیا ہے۔ خصوصاً 'وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا' جیسے موثر بند کے بارے میں لکھا ہے ''رسول کی بنیادی صفت یہی ہے؟ خطا کار سے درگزر کرنے والا''۔ ''نہیں کیونکہ اتنا کام تو خود مولانا حالی بھی کر لیتے ہوں گے''۔

(۱۰) عسکری نے بھی اس نظم کا شمار اردو کی اعلےٰ ترین نظموں میں کیا ہے۔ مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور (۱۹۹۴ء) ص ۴۱۱

(۱۱) **تاریخِ ادبیات ایران**؛ رضا زادہ شفق، وزارتِ فرہنگ ایران، تہران (س-ن) ص ۱۴۶

(۱۲) مقدمہ سفر نامہ حکیم ناصر خسرو مع اردو ترجمہ از محمد صدیق طاہر شادانی، مجلس ترقی ادب، لاہور (۱۹۷۳ء) دیباچہ از پروفیسر حمید احمد خاں، ص ج

(۱۳) **شعر العجم**، جلد دوم؛ مولانا شبلی نعمانی، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، لاہور (س-ن) ص ۲۹

(۱۴) **گنجینۂ ادب**؛ مرتب: عابد علی عابد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور (س-ن) ص ا

(۱۵) ایضاً؛ ص ۲

(۱۶) **مطالعہ حالی**؛ ڈاکٹر وحید قریشی، اردو بک سٹال، لاہور (۱۹۶۱ء) ص ۸۹

(۱۷) **غالب نامہ**؛ شیخ محمد اکرام، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی (۲۰۰۵ء) ص ۸

(۱۸) **رموزِ غالب**؛ ڈاکٹر گیان چند جین، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی (۱۹۹۹ء) ص ۳۷۰

(۱۹) **انتخابِ مقالات غالب نامہ تحقیقات**؛ مرتب: پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی (۱۹۹۷ء) ص ۳۰۰

(۲۰) ایضاً؛ ص ۳۱۲

(۲۱) **سرسید احمد خاں اور مسلمانوں کی تحریکِ علیحدگی** (انگریزی مقالہ برائے پی ایچ-ڈی کا دیباچہ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی مرکزی لائبریری (۱۹۵۰ء)۔

(۲۲) **حیاتِ جاوید**؛ الطاف حسین حالی، اکادمی پنجاب، لاہور (۱۹۵۷ء) ص ۹۱

۲۳) ایضاً؛ص ۳۶۷

(۲۴) ایضاً؛ص ۲۷۷

(۲۵) **مقدمہ شعر و شاعری**؛ مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی، نیا ادارہ، لاہور (۱۹۵۳ء) ص ۱۹

(۲۶) **حالی مقدمہ اور ہم**؛ وارث علوی، آج کی کتابیں، کراچی (۲۰۰۰ء) ص ۳۷

(۲۷) **مقدمہ شعر و شاعری**؛ص ۹۸

(۲۸) **مسدس حالی**؛ بزم اقبال، لاہور (۲۰۰۳ء) ص ۹

(۲۹) ایضاً؛ص ۱۱

(۳۰) لینڈر کے تعارف کے لیے دیکھیے:

A History of English Literature by Emile Legouis & Louis Cazamian, London. Reprinted 1961. Pages 1081 to 1084.